برزخ

لڑکی کی عمر نکل جائے یا نکل رہی ہو تو اس پر سہم سوار ہونے لگتا ہے اور سہم دو قسم کا ہوتا ہے، اگر لڑکی ذہین ہے سہم مستقبل سے متعلق ہوتا ہے اس کی دور اندیشی اسے آگے اندھیرا بتاتی ہے۔ لڑکی دوسروں کی سوچ کے مطابق چلنے والی ہو اور قطعی اپنے ذہن سے فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہ رکھتی ہو تو اس کا سہم دوسری قسم کا ہوتا ہے یعنی صرف زمانے کی باتوں کا سہم، زمانے کے طعنوں کا سہم۔ لڑکی برسرِ روزگار ہو تو مختلف کیفیات سے دوچار ہوتی ہے۔ مطمئن و نا مطمئن مگر سہمی ہوئی نہیں ہوتی کہ جب لڑکی باہر قدم نکالتی ہے تو اس کا ہر قسم کا سہم آہستہ آہستہ ختم ہونے لگتا ہے۔ لڑکی تیس برس سے اُوپر ہو جائے اور پیدائش سے مفکر ہو یعنی سوچ بچار و مستقبل کے اندیشوں میں گھرے رہنے کی عادی رہی ہو تو خطرناک حد تک اعصابی مریضہ بن جاتی ہے۔ چڑچڑی اور بدمزاج۔

جویریہ عرف رانی تیس کے شیر کو اپنے تعاقب میں دیکھ رہی تھیں۔ ان کا شمار مندرجہ بالا دوسری قسم میں ہوتا تھا۔ معاشرتی لحاظ سے ان پر ترس کھائے جانے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ کتنی حیرت کی بات تھی لنگڑی، لولی، کانی، بھینگی، سیاہ، برصی، جاہل، گنوار کوئی تو عیب نہ تھا۔ خوبصورت تھیں بس زُلفیں دراز نہ تھیں، باقی ہر طرف سے مطمئن کرتی تھیں۔ کسی نے ان کے رشتے میں روڑے بھی نہیں اٹکائے، نہ انہوں نے محبت کی، نہ ظالم سماج سے پالا پڑا۔ پھر بھی وہ ابھی تک کنواری تھیں۔

ان سے چھوٹی ساریہ آٹھ برس چھوٹی تھی، جب وہ بیس برس کی تھیں ساریہ بارہ برس کی

تھی اب وہ انتیس کی تھیں اور سارہ اکیس برس کی۔ پہلے امی جان چٹکیوں سے پکڑ پکڑ کر رانی کے جوڑے گنا کرتی تھیں اور اُنگلیوں کی پوروں پر ان کی کھسکتی بلکہ ان کے حساب سے بھاگتی عمر۔ رشتے تو آئے مگر رانی کے قابل کوئی نہ آیا۔ شاید اس میں ان کے گھریلو ماحول کا دخل رہا ہو۔ وجاہت شیخ کا ٹھوکر سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہونا اور شیر کی طرح گرجنا برسنا۔

ساری عمر انہیں اپنی کمائی کا زعم رہا۔ ساری زندگی بیوی بچوں پر احسان جتاتے گزری کہ تم منحوسوں کی خاطر صبح نکلتا ہوں اور رات کو گھستا ہوں۔

اچھی خاصی معقول تنخواہ تھی مگر وجاہت شیخ کی بیگم ان سے اس قدر سہمی ہوئی تھیں کہ اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات کو پورا کرنے کا اہتمام سلائی کر کے کیا کرتی تھیں جس کی بھنک ساری زندگی وجاہت شیخ کو نہ ملی۔

کبھی اللہ کے بندے نے اُٹھتی جوان بیٹی کے معاملے پر بیوی سے گفت وشنید نہ کی حتیٰ کہ وہ خود کبھی کسی رشتے کا ذکر کرتیں تو تڑخ کر جواب ملتا، کیوں بھاگی جا رہی ہے.....؟ میں اس قدر گیا گزرا نہیں کہ بیٹی کا بر تلاش کرتا پھروں۔ اور اب اس کا علاج وہ سہمی ہوئی عورت کیا کر سکتی تھی۔

اب یہ رانی کی بدقسمتی ہی تو تھی کہ معقول خواتین رشتے کے سلسلے میں آئی بیٹھی ہوتیں۔ عین اس دن وجاہت شیخ بھی جلد آ جاتے۔

''تمہاری ماں کہاں ہے.....؟''

''اندر مہمان عورتیں آئی ہیں ان کے پاس بیٹھی ہیں۔''

''کون عورتیں ہیں.....؟''

''پتا نہیں.....!''

''انجان لوگوں کو اس قدر منہ لگانے کی کیا ضرورت ہے.....؟''

پھر برآمدے میں کھڑے ہو کر زور زور سے بولتے، ''جویریہ کی ماں، چلو بھئی ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔''

وہ گھبرا کر باہر نکل آئیں، ''ڈڈ.....ڈاکٹر.....''

''کون ہیں یہ.....؟ انہیں جلدی فارغ کرو۔''

''وہ جو پروین.....''

''میں کہتا ہوں جلدی کرو۔''

اب تینوں ماں بیٹیوں کی عزت پر بن آتی اور پھر جانے کس طرح ان عورتوں کو ٹالتیں۔

''رانی کے رشتے کے لئے آئی تھیں۔'' ان کے جانے کے بعد وہ ان کی صورت کو بیزاری سے دیکھتیں۔

''نہیں کرنی ہمیں غیروں میں شادیاں۔''

''اپنوں میں کون سے لڑکے ہیں.....؟''

''ہو جائیں گی شادیاں بھی۔''

وہ بیوی تھیں، باندی تو نہیں، ہلکا ہلکا احتجاج کر بیٹھتیں۔ ''یہ عمریں نکل جائیں تو کوئی نہیں پوچھتا، فجر کے وقت گھر میں آنکھ نہ کھلے تو کفر کے فتوے دینے لگتے ہو، دین ایمان کا تذکرہ اسی گھر میں زیادہ ہوتا ہے۔ اتنا بھی معلوم ہوگا جس گھر میں جوان کنواری لڑکی ہو اس گھر کا کھایا پیا بھی حرام ہوتا ہے۔''

''ہاں اتنے دنوں سے اس گھر میں حرام ہی تو کھا رہی ہو ناں۔ چلی جاؤ اس گھر سے، لگا دو بیٹیوں کی بولیاں۔'' زبان گراوٹ کی حدیں پار کرنے لگتی۔

دونوں لڑکیاں خوف سے کانپنے لگتیں۔ امی جا کر باورچی خانے میں کھٹر پٹر کرنے لگتیں۔

اور دیکھا گیا ہے جس گھر میں میاں بیوی کی عدم اتفاقی ہو یا ذہنی ہم آہنگی نہ ہو یا گھر کا مرد ''آمر'' ہو، اس گھر کے بچے سکھ کے سانس کو ترستے ہیں۔

بیٹیاں بالوں میں چاندی سجا بیٹھتی ہیں۔

یہاں یہی تو ہو رہا تھا۔ وہ تابعدار قسم کی لڑکی پہروں اپنے ناکردہ گناہوں پر غور کرتی اور اَشک بہاتی تھی۔ باپ کے لئے اس کے دل کا کوئی گوشہ نرم نہیں تھا۔ باپ نے بھی تو کبھی عید تہوار پر ان کے سروں پر ہاتھ رکھ کر دُعا نہ دی تھی۔

عید کے دن کہیں سہیلیوں سے ملنے چلی جاتیں تو واپسی پر باپ کو ٹہلتے پاتیں۔

''اتنی دیر گھر سے باہر جوان لڑکیوں کا رہنا اچھا نہیں ہوتا۔''

"شکر ہے تمہیں احساس تو ہوا کہ گھر میں جوان بیٹی ہے۔"

امی کی بڑبڑاہٹ میں زہر مل جاتا۔

اور رانی کے اندر کوئی چیز چھن سے ٹوٹ جاتی۔

ابا جی کو کیا ہم پر اعتبار نہیں.....؟

کیا ہم پر اس انداز میں شک کیا جا سکتا ہے.....؟

اس کے چہار سو اندھیرا منڈلایا کرتا۔

ماں سے زیادہ کون جاننے والا ہو سکتا ہے لیکن ماں اگر بے دست و پا ہو.....؟

اور اب تو انگاروں پر چلنے کا وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا بلکہ گزر ہی گیا تھا۔ اب اسے اپنی نہیں چھوٹی بہن ساریہ کی فکر رہتی تھی۔ ساریہ عجب بے نیاز قسم کی لڑکی تھی۔ باپ کی باتوں کا از حد برا مناتی تھی۔ من مانی بھی کرتی تھی۔ باپ چیخے یا دھاڑے اس کی جانے بلا۔ بے دھڑک اِدھر اُدھر گھومتی رہتی جبکہ وہ دونوں ماں بیٹی چیخ پکار کے وقت کسی کونے میں جا بیٹھتی تھیں۔ اس نے کبھی نماز قضا نہ کی تھی۔ "جی" سے آگے کچھ بول کر نہ دیا تھا، صورت شکل میں ایک تھی مگر قسمت بہت کالی تھی۔ جب ہی تو ساریہ جیسی واجبی شکل کی لڑکی کو اس کی خالہ بیاہنے آ گئیں یا شاید انہیں بہن پر ترس آ گیا تھا۔

اس کے نام رکھا جمع شدہ سامان ساریہ کو منتقل ہو گیا۔ اس کے جلا دصفت باپ کو بھی وقت کی ٹھوکروں نے نڈھال کر دیا تھا۔ بعض لوگ بڑے انا پرست و خود سر ہوتے ہیں۔ شروع سے اپنی غلطیاں دیکھتے ہیں مگر اعتراف و تدارک کسرِ شان سمجھتے ہیں مگر پھر وقت ایسے لوگوں کو کڑے حساب سے پوچھتا ہے اور وقت نے وجاہت شیخ سے کڑا حساب لینا شروع کر دیا تھا۔ تب ہی تو دوسری بیٹی بیاہنے میں دیر نہ لگائی۔

لیکن جس کا بگڑنا تھا، اس کا تو خوب بگڑا تھا۔ اس کے زخموں کا مداوا کس کے بس کی بات تھی.....؟ نہایت صبر و ضبط سے بہن بیاہی۔ دل سے اس کی خوشیوں کی دُعائیں کیں۔

اور پھر خالی دامن جھٹک کر ایک طرف ہو گئی۔

بیاہ، نتھ بندیا کا نام نہیں۔

نکاح، کسی عصرانے، عشائیے کا نام نہیں۔

شادی تو دو انسانوں کے محفوظ بندھن کا نام ہے۔ ایک دوسرے کی محبت میں احساسِ تحفظ کے ساتھ وقت کاٹنے کا نام ہے۔ وقت جو وجود میں کرچیاں بھر دیتا ہے۔ ان کرچیوں کو وجود سے چننے والا نہ ملے تو مرد ہو یا عورت ایک کرب انگیز اُدھورے پن میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لوگوں کے نامناسب و ناجائز ترس و ترحم ایک کنواری عمر رسیدہ کو شدید احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

یہی چیزیں اس پر صادق آ رہی تھیں۔ کہیں آتے جاتے کتراتی تھیں کہ خواتین گھوم پھر کر اس کی ذات کو ہی موضوع بنائیں گی۔ اس پر ترس کھائیں گی۔ مستقبل کے اندیشوں سے دہلائیں گی۔ وہ گھر میں قیدی رہتی تھی کہ اچانک گھر میں زندگی دوڑ گئی۔ ابا جی کے بھتیجے مع اپنی بیگم اور دو سالہ بیٹے کے ہمراہ ان کے گھر چلے آئے۔ ان کا کوئی دفتری کام بھی تھا۔ بیگم اس خیال سے ساتھ لے آئے تھے کہ کراچی کی سیر کر لیں گی۔

وہ اپنے ان چچازاد کو برسوں بعد دیکھ رہی تھی۔ بچپن میں دیکھا تب بھی وہی اپنے ماں باپ کے ہمراہ کراچی آئے تھے۔ وہ تو ویسے ہی خاموش اور الگ تھلگ رہنے والی لڑکی تھی۔ ہاں اس بار اسے خود ہی میزبانی کرنا تھی کہ امی کی مشینری تو اب ڈیمج تھی۔

وقار علی واقعی بے حد وقار و خوبصورت و طرح دار، خوش لباس نظر آتے تھے جبکہ ان کی بیگم ان کا سایہ دِکھتی تھیں، بانس کی طرح طویل ضرور تھیں مگر جسمانی اُتار چڑھاؤ میں تناسب نہ ہونے کے سبب قیمتی سے قیمتی لباس بھی ان کے جسم پر بے قیمت ہو جاتا تھا۔ رنگ سفید تھا، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، پتلے ہونٹ مگر اللہ کو شاید اس وقت تراش خراش کی فرصت نہ تھی۔ ساس کو غالباً ان کا سفید رنگ ہی بھایا تھا۔ آواز میں تحکم چال میں تیزی۔ وہ بالکل وقار علی کا جوڑ نہ لگتی تھیں۔

بچہ البتہ بے حد پیارا تھا۔ وقار علی کی شادی پر صرف ابا جی ہی اسلام آباد گئے تھے۔ اس لئے وہ بھابی سے پہلی مرتبہ مل رہی تھی۔ سیاہ زمین پر سرخ پھولوں سے بھرے لان کے سوٹ میں رانی کے چہرے پر پھولوں کا عکس تھا، اس کے تراشیدہ ہونٹوں پر پراخلاق میزبان مسکراہٹ تھی۔ بھابی نے بغور اس کا جائزہ لیا، ایک احساسِ کمتری کا جذبہ ان کے وجود میں پھیلنے لگا۔

ان کے لہجے میں ایک عجیب سی کاٹ ہوتی تھی جو شروع میں نظر انداز کی جاتی رہی۔

''ارے بھئی.....! کیا تمہارا کوئی رشتہ نہیں آیا ابھی تک، اچھی خاصی تو ہو۔ چھوٹی والی ذرا زیادہ خوبصورت ہوگی۔ ہے ناں.....؟

خیر اب بھی تمہارا کچھ نہیں بگڑا۔ بعض مردوں کی بھی دیر میں شادیاں ہوتی ہیں، تمہارے ناپ کا بھی مل ہی جائے گا۔'' وہ اپنی دانست میں گویا مذاق کرتیں جو سیدھا اس کے دل کے پار ہو جاتا۔

ایک دن کچن میں وہ بریانی دم کر رہی تھی، بھابی چلی آئیں۔ اِدھر اُدھر کی تھوڑی بہت سر لے کر اچانک گویا ہوئیں۔

''رانی.....! تم نے کبھی محبت بھی نہیں کی.....؟''

وہ بری طرح سٹپٹا گئی۔

''اچھی خاصی ہو..... خیر لڑکے تمہیں پسند تو ضرور کرتے ہوں گے.....؟''

لڑکے.....؟ کون سے لڑکے.....؟ رشتے دار لڑکے.....؟ محلے کے لڑکے.....؟ کون سے لڑکے.....؟

ابا جی تو شاید خون کا آخری قطرہ بھی پی جاتے اگر وہ کسی لڑکے سے بات بھی کر لیتی۔

محبت تو بڑی بات ہے، مجھے تو کوئی لڑکا بھی صحیح یاد نہیں۔ بس وہی جنہیں بچپن میں دیکھا تھا۔

محبت.....؟ ایک سنسناہٹ اس کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔

وہ بھابی کی ساری باتوں کے جواب میں صرف ایک تلخ ہنسی ہنس کر رہ گئی۔

بھابی کو اس کی محرومیوں کے تذکرے سے شاید تسکین ملتی تھی۔ اس سے گفتگو کے وقت ان کا موضوع یہی دل آزار باتیں ہوتیں۔ وہ بہت بچنا چاہتی مگر وہ کسی نہ کسی طرح جا لیتیں۔ تین چار دن کی مسلسل مصروفیت کے بعد وقار علی کو دم لینے کا موقع ملا تو انہوں نے سانس لیتے لیتے اس کا بھی بھرپور جائزہ لے ڈالا۔ مرد شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، عورت کو دیکھنا اس کا جائزہ لینا اس کی فطرت ہے۔ خلوت ہو یا جلوت، محفل خاندانی ہو یا غیر خاندانی، سڑک ہو یا سواری، ہر جگہ، عورت کو دیکھنا اس کی اہم فطرت ہے۔ نگاہ ڈالنا فرضِ اوّلین ہے۔

وہ تو سدا سے ان نگاہوں کی برتی ہوئی تھی۔ اسکول جاتے ہوئے، پورے گروپ کی

نمایاں لڑکی۔ اوباش لڑکوں کے فقرے سن کر اس طرح آگے بڑھتی گویا بہری ہو۔ چادر میں سے جھانکتا حسین مکھڑا اسٹاپ پر چاند بن کر چمکتا۔ جب تک بس نہ آتی کتنی نگاہوں کی زد میں رہتی۔

مگر نگاہ نگاہ میں فرق ہوتا ہے۔ جذبے خاص ہوں تو نگاہ بھی خاص بن جاتی ہے۔ اس کا اندازہ اسے آج ہوا۔

بھابی تو حسب معمول امی سے ساس نندوں کے دکھڑے رو رہی تھیں۔ وقار علی کی مصروفیت کا شکوہ۔ وہ اباجی کو ناشتہ دینے کے بعد گھر کی صفائی میں لگ گئی، وقار علی کے اُٹھنے پر سب نے ناشتہ کرنا تھا۔ وہ بھابی کے پلنگ کی چادر بدلنے کمرے میں چلی آئی کہ جو کام کرنا ہے وہ کرنا ہے، تکیوں پر غلاف چڑھائے، بستر کی چادر بدلی، پانچ فٹ کے فاصلے پر وقار علی کا پلنگ تھا۔ وہ آہستگی سے اپنا کام کر رہی تھی، اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ آنکھیں اس پر مسلسل مرکوز ہیں۔ اس احساس کے تحت اس نے بے ساختہ نظریں اُٹھائیں تو دل اُچھل کر حلق میں آ گیا وقار علی کی آنکھیں نیند کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ ان کے پختہ ارادوں کے مظہر بھنچے ہوئے خوبصورت لب مزید بھنچ گئے تھے۔ وہ کروٹ بدلے بدستور اسے دیکھ رہے تھے۔

مرد کا یہ ایک ٹک دیکھنے کا انداز، کسی بھی عورت کی ساری خود اعتمادی چھین سکتا ہے، خاص طور پر اس عورت کی جسے کسی مرد نے اس طرح کبھی نہ دیکھا ہو۔

وہ باہر نکلنے لگی تو پشت سے آواز آئی۔ بھاری آواز۔

''رانی.....!''

اس نے دروازے پر رُک کر انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''جی.....؟''

''کچھ نہیں.....'' انہوں نے شاید خود پر قابو پا لیا تھا۔ ''عائشہ کو بھیجنا ذرا۔'' آخر کچھ تو کہنا تھا۔ وہ باہر چلی آئی اور تہیہ کر لیا، آئندہ ان کی موجودگی میں کمرے میں نہیں جائے گی، زیادہ پروا اس نے اس لئے نہیں کی تھی کہ وہ شادی شدہ مرد تھے۔ کوئی کھلنڈرے لڑکے نہیں۔ مگر، خیر اب آئندہ احتیاط کرے گی۔

بھابی ایک الگ اُلجھی ہوئی عورت تھیں۔ مرد کا ناک میں دم کرنے والی عورت۔ آج یہاں چلیں آج وہاں چلیں۔ ابھی وہ دوپہر کے کھانے کا انتظام ہی کر رہی تھیں امی کے ساتھ کہ

وہ میاں سے لڑ بھڑ کر بھی آ گئیں۔

''ہونہہ قید کر کے رکھا دیا ہے۔ نیا شہر ہے مجھے کچھ پتا بھی نہیں اکیلے آ جا بھی نہیں سکتی۔ فریدہ کتنا خط لکھ لکھ کر بلاتی تھی۔ صاحب بہادر کو آج پھر کام پڑ گیا ہے۔ چچی جان آپ کو بہادر آباد کا پتا ہے.....؟''

''نہیں بیٹی.....! مجھے تو بس دو چار جگہوں کا پتا ہے۔ سار یہ کو تو پھر بھی بسوں، راستوں کا پتا تھا۔ رانی بھی نہیں واقف راستوں سے، کیونکہ آنے جانے کی شوقین نہیں۔ بس ڈیفنس بھی ایک مرتبہ میرے ساتھ گئی تھی اپنی پھوپھی کے چہلم میں۔'' امی نے مفصل بتایا۔ مبادا دلہن یہ نہ سمجھ لیں کہ انہیں ٹالا جا رہا ہے۔ اس پر بھابی ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی تھیں۔

♦ ♦ ♦

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر وقار علی ابا جی سے مصروفِ گفتگو ہو گئے۔ بھابی گڈو کو لے کر کمرے میں چلی گئیں۔ امی اپنے بستر پر پان دان کھولے بیٹھی تھیں۔ اس نے کچن سنوارا، وضو کیا اور چھت پر عشاء کی نماز کے لئے چلی گئی۔

نماز سے فارغ ہو کر وہ منڈیر پر کہنیاں ٹکا کر سامنے جانے کیا تلاش کرنے لگی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کے وجود میں سرور بھرنے لگے۔ آج کے سارے واقعات اس کی نگاہوں میں گھوم گئے۔ آہ وہ، خوبصورت سے انداز میں جب دل لرزا تھا۔ مردوں کی نگاہ میں کیا ہوتا ہے.....؟ جو وقار علی کی نگاہ میں تھا۔ کیا سب ہی مرد۔

وہ تو بالکل ہی اَن چھوئی وانجان تھی۔ گھر میں اخبار و رسالے بھی نہیں آتے تھے کبھی کہ فضول خرچی ہے عیاشی ہے۔ ٹی وی سار یہ کی شادی کے بعد آیا تھا۔ ڈرامے وہ دیکھا کرتی تھی، خبریں بھی سنا کرتی تھی۔ بات بات پر اس کی عقل حیران ہوتی تھی۔ ہر دو میں سے ایک بات اس کے لئے اچنبھا تھی۔ نہ زندگی میں کبھی مرد آیا، نہ کوئی گہری سہیلی۔ کبھی ابا جی کا حکم تھا، اب وہ خود آدم بیزار تھی۔ وقار علی کی نگاہوں نے جانے اس کے کون کون سے گداز جذبے جگا ڈالے تھے۔

مگر اسے یہ بھی پتا تھا کہ انہیں یہ سب زیبا نہیں۔ وقت سب سے بڑا اُستاد ہے۔ کسی

سے نہ ملو تو کیا عقل کی، جذبات کی نشو و نما رُک جاتی ہے.....؟ دُنیا کا ہر کام ہر حال میں جاری رہتا ہے، عقل اور سمجھ تو وقت کے ساتھ ساتھ آتی ہی ہے، البتہ جس نے دُنیا نہ برتی ہو وہ زمانہ ساز نہیں بن سکتا۔ بس وہ باشعور تو تھی زمانہ ساز نہیں تھی۔

جبر کی لوریوں سے سلائے ہوئے سارے حسین جذبے کسی فاقہ مست کی اولاد کی طرح روتے بسورتے اس کے چہرے کے روبہ رو تھے، وہ نگاہ بچا رہی تھی۔ سوچ رہی تھی۔ کاش.....! وقار علی شادی سے پہلے ہمارے ہاں آئے ہوتے مگر کیا اس وقت اماں مجھے یعنی انتیس تیس سالہ کو بیاہ لے جانے پر راضی ہو جاتیں..... لاحول ولا قوۃ کیا بے کار کی سوچیں ہیں۔ توبہ، کیا ہو گیا ہے مجھے.....؟ مم، میں نے کبھی غیر شادی شدہ مرد کے بارے میں اس قدر نہیں سوچا اور یہ وقار علی۔

خیر اگر یہ چار برس قبل آتے تو اس وقت تو میں صرف..... اوہ میرے خدا.....! کیا ہو گیا ہے مجھے۔ میرے رب میرے حال پر رحم فرما۔

بے بسی کے لمحوں میں آئے اَشک اس نے پونچھ ڈالے۔ اس کی چوڑیاں بج اُٹھیں اندھیرے میں گویا لمحاتی ارتعاش ہوا، تب اسے ایسا لگا جیسے چھت پر کوئی اور بھی ہے، اس کی روح مردہ ہو گئی۔ اس نے نیچے صحن میں جھانکنے کی کوشش کی، یہ دیکھنے کے لئے کہ سب لوگ سو گئے ہیں کیا۔ صحن کی لائٹ آف ہو چکی تھی۔ البتہ برآمدے میں روشنی ہو رہی تھی۔ اس کی کچھ ڈھارس بندھی، اس نے ہمت کر کے پیچھے دیکھا۔ امی ٹھیک کہتی ہیں رات کو چھت پر نہ جایا کرو۔

شاید چوریا بھوت کو روبہ رو دیکھ لیتی تو یہ حالت نہ ہوتی جو وقار علی کو سامنے دیکھ کر ہو رہی تھی۔ ''پنجابی نائٹ ڈریس۔'' یعنی سبز لاچے اور سفید بنیان میں ان کا صحت مند جسم بے حد نمایاں تھا۔ ان کے گندمی بازو چمک رہے تھے۔ اس قدر دل کش لگنے کے باوجود وہ اسے بھیانک عفریت لگ رہے تھے۔ وہ آہستہ سے آگے بڑھ آئے۔

''تم ہو رانی.....! نیچے مجھے کافی گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ سوچا ذرا ٹھنڈی ہوا میں ٹہل آؤں، دیکھا تو یہاں تم موجود ہو۔'' ذہین آدمی تھے جھٹ وضاحت پیش کر گئے تھے۔ وہ زینے کی طرف بڑھی، بنا کوئی بات کئے۔

''رانی.....!''

وہ رُک گئی۔

''کیابات ہے بھئی میں کھاجاؤں گا تمہیں......؟''

سامنے والی عمارت کی روشنی ان کے چہرے پر پڑی۔

ان کی موچھوں تلے لب مسکرا رہے تھے۔ ایک بار پھر اس کی روح سرد ہوگئی۔ مرد کی مسکراہٹ سہنا کوئی آسان کام نہیں۔

''نہیں......میرا مطلب ہے۔ رات شاید بہت ہوگئی ہے۔'' وہ جھجک کر بولی۔

''رات بہت ہو یا کم، رات تو رات ہے۔'' ان کی بھاری آواز اُبھری، وہ مزید گویا ہوئے۔ عائشہ کو تمہاری بڑی فکر ہے۔ کہہ رہی تھی کہ تم شادی کی عمر پھلانگتی جارہی ہو۔ لگتی تو نہیں ہو۔ رانی......! شادی خوشیوں کی معراج تو نہیں ہوتی۔ ضروری تو نہیں کہ انسان کو شادی کے بعد آسودہ و خوشیوں بھری زندگی نصیب ہو۔ ہوسکتا ہے تم مجھ سے زیادہ، عائشہ سے زیادہ خوش ہو اور ہم شادی شدہ ہوکر بھی۔''

اُس نے چونک کر وقار علی کا چہرہ دیکھا۔ ''آ......آپ کے پاس کیا کمی ہے......؟''

''بعض اوقات ایسا ہوتا ہے رانی کہ انسان کے پاس بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہوتا۔ میں حیران ہوں کہ میرے ساتھ یہ سب کیسے ہوگیا۔ میں کلچرڈ، پراعتماد، کلاس ون آفیسر ہوں اور میری شادی صدیوں پرانے طریقے سے ہوئی یعنی عائشہ کو امی نے پسند کرلیا۔ میرے سامنے قصیدے پڑھے گئے اور میری شادی ہوگئی، میں سوچتا ہوں۔ آخر ہمارے گھر والوں کو تم، میرا مطلب ہے......''

(بس......بس......اس نے کانپ کر وقار علی کی شکل دیکھی، بس اب رُک جاؤ، آگے کچھ نہ کہنا)۔

''سب، بھابی، اتنی اچھی تو ہیں۔'' اس نے بہ دِقت کہا۔

''ہاں بہت اچھی ہے وہ......رانی اچھے تو ڈھیروں لوگ ہوتے ہیں، سب پہ دل کیوں نہیں ٹھہرتا......؟''

وہ پھر بزدلوں کی طرح چپ ہوگئی۔

رات کی تاریکی میں کھڑے ہوئے دو ذی نفس چپ تھے مگر ٹوٹ کر ایک دوسرے کو محسوس کررہے تھے۔ بغیر آواز کے بہت کچھ سن رہے تھے۔ اس کا دل تو اس قدر زور زور سے

دَھک دَھک کررہا تھا، شاید وقار علی تک بھی آواز جارہی تھی، وہ پلٹ گئی۔

''رانی......!'' وہ بے اختیار پکار اُٹھے۔ ''وہ میں کہہ رہا تھا۔''

''وقار بھائی......! آپ کو یہ سب زیب نہیں دیتا۔'' اس کی پرانی ٹھنڈی روح نے پھر اس کے وجود پر قبضہ کرلیا۔

''پلیز......! آئندہ مجھ سے اس قسم کی......''

''معاف کرنا رانی......! دراصل......''

''پیروں میں گر جایئے وقار صاحب......!'' عائشہ کی تیز آواز سماعت چیر گئی اور وہ تو جیسے مرنے کو ہوگئی۔

''تمیں سال سے سنبھال رہی ہو خود کو، تین چار دن اور سنبھال لیتیں۔ کم از کم کیے کرائے پر پانی تو نہ پھرتا۔''

''بھابی......!'' اس کی تو جیسے گویائی سلب ہورہی تھی۔

''مت کہو مجھے بھابی......! واہ کیا میزبانی ہے۔ ایسی بھی کیا نااُمیدی کہ دوسروں کے شوہروں پر......ارے مجھے تو تم سے پہلے ہی ہمدردی تھی، تمیں پینتیس کا کنوارا تو میں ہی ڈھونڈ لاتی۔ چار دن کی میزبانی کا معاوضہ بہت زیادہ ہے رانی بیگم......!''

''عائشہ......!'' وقار علی گرجے۔ ''شرم نہیں آتی تمہیں، اسی کی چھت پر اسی کو نام دیتے ہوئے۔''

''تو اپنی چھت پر لے چلیئے، وہاں دے دوں گی ملکہ عالیہ کو خطاب۔ ارے میں تو دنوں سے آپ کی نظر کا زاویہ دیکھ رہی ہوں۔''

''کیا یہ میری کزن نہیں کہ میں اس سے بات نہیں کرسکتا......؟''

''بیوی سے بات کرنا ہو تو ساڑھے گیارہ بجے جماہیاں آتی ہیں، کزن سے چھت پر رات ایک بجے گفتگو ہوتی ہے، سبحان اللہ......! جایئے جا کر کسی اور کو بنایئے۔ دراصل آپ کا بھی قصور نہیں، دیر کچھ زیادہ ہوگئی ہے۔''

عائشہ نے کٹیلی نظریں اس کے سراپے پر گاڑیں۔ ''بی بی......! دیر ہی تو ہے ناں، اندھیر تو نہیں۔''

''بھابی.....!'' وہ غصے سے کانپ اُٹھی۔

''مت کہو مجھے بھابی.....! کاش تمہاری ماں کے ایک بیٹا بھی پیدا ہو جاتا۔ تمہیں بھی پتا چل جاتا کہ بھائی کیا ہوتے ہیں۔''

''آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔''

''شکر ہے بابا جو سمجھا جلدی سمجھا۔ ارے میں تو تفریح کرنے آئی تھی، کرانے تو نہیں۔''

تب وہ لرزتے قدموں سیڑھیاں اُتر گئی۔ ساری عمر کی محنت پر اس طرح پانی پھرتا تھا۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے، اس کے وہم وگمان میں نہ تھا۔ وہ تو خود ان کو دیکھتے ہی نیچے آنے کے لئے پر تول رہی تھی۔ مارے اخلاق کے اس نے شروع میں جواب بھی دے دیا مگر ان کا کانٹا بدلتے دیکھ کر ویسے ہی ان کی جان پانی ہوگئی تھی اور وہ نیچے آرہی تھی۔ بھابی کی باتوں نے اس کا دماغ اُلٹ دیا تھا ذرہ برابر بھی تو مروّت نہ برتی۔ اس کے آنسو رواں ہوگئے۔ ایسی ذلت.....؟ کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔

♦ ♦ ♦

صبح گھر میں بھونچال آگیا تھا۔ بھابی ایک منٹ رُکنے کی روادار نہ تھیں۔ باقاعدہ رو رو کر سامان باندھ رہی تھیں۔ امی اور اباجی کی تو جیسے روحیں پرواز کر گئی تھیں۔

''ہونہہ.....! سارا خاندان کلمے پڑھتا ہے، رانی یوں ہے، بتاؤں گی سب کو پارسائی، میری تو عقل حیران ہے۔ اب تک کس طرح بیٹھی رہی۔''

''دُلہن.....! خدا کا واسطہ۔'' امی نے بھابی کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''ہونہہ.....!'' انہوں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

تب امی نے ایسے سوالیہ نظروں سے دیکھا، اس نے حرف حرف ماں کو سچ بتا دیا اور ساری عمر کی برتی ہوئی بیٹی تھی، دیکھی بھالی۔ انہیں اعتبار آگیا۔ انہوں نے عائشہ کی غلط فہمی دُور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ تو بری طرح بدکی ہوئی تھیں۔ وقار علی وجاہت شیخ کے سامنے جانے کی ہمت تو نہ کر سکے البتہ چچی سے بہت شرمندگی سے معافی مانگ چکے تھے۔ اِدھر وہ رو رو کر ہلکان ہوگئی تھی مگر عائشہ کو سارا ڈرامہ لگ رہا تھا۔

''ایک ایک کو بتاؤں گی، ایک ایک کو۔''

''بکواس بند کرو عائشہ.....! وقار علی گرج پڑے۔ ''حد ہوتی ہے برداشت کی۔''

عائشہ بھوکی شیرنی کی طرح غرائیں۔ ''کوئی ضرورت نہیں مجھ پر چمکنے کی۔ ہونہہ..... ایک تو چوری اس پر چترائی۔''

اسی دم ساریہ بھی اپنے شوہر کے ہمراہ چلی آئی۔ گھر کا نامانوس ماحول اسے بھی چونکا گیا۔ کسی کو بتانے کی ضرورت نہ پڑی۔ عائشہ کے منہ سے اُگلتے انگارے ساریہ کے کانوں میں بھی جا پڑے۔ وہ کانپ کر میاں کو ایک کمرے میں بٹھا کر باہر آئی۔ اس نے کانپتی لرزتی بہن کو دیکھا۔ اسے ایک دم ترس آگیا۔

''امی.....! میری باجی ایسی نہیں ہیں۔''

''مت کریں منتیں عائشہ بھابی کی..... پتا نہیں خود کو کیا سمجھ رہی ہیں۔''

اس نے نفرت سے عائشہ کو دیکھا۔ ''اگر میری باجی ایسی ہوتیں تو اب تک بیٹھی ہوتیں.....؟ لعنت ہے ایسی ذہنیت پر..... حد ہوگئی۔''

وہ بری طرح کھول رہی تھی۔ طوفان گزر گیا، نشان رہ گئے۔ رانی کی حالت مردوں سے بدتر تھی۔ ایسا لگتا، ایک جہاں اس کے منہ پر تھوک رہا ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی وہ ہچکیوں سے رو پڑتی۔ ساریہ اسے دِلاسے دے کر گئی تھی کہ جو بکتا ہے بکنے دیں۔ مگر اس کے اعصاب سوچ سوچ کر شل ہو چکے تھے کہ کیا اس داغ کے ہمراہ عمر گزرے گی۔

رات کو وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں جا رہی تھی کہ اباجی کی آواز کان میں پڑی۔

''رانی کی ماں.....! کوئی بنا دیکھے اس قدر چیخ کر بہتان نہیں باندھ سکتا، ہوسکتا ہے عائشہ ٹھیک کہہ رہی ہو۔ رانی کی ماں.....! مجھے اپنے آپ پر ندامت ہے کہ میں بیٹی کی طرف سے غافل رہا، ہوسکتا ہے۔''

ہوسکتا ہے.....؟ ہوسکتا ہے.....؟ ماں باپ تو بچوں کے عیب چھپاتے ہیں، انہیں معصوم و بے گناہ ثابت کرنے کے لئے بہت کچھ کر بیٹھتے ہیں، یہ کیسا باپ ہے جو ذہن میں آئے اعتراف کو زبان دے رہا ہے۔ اگر نااعتباری کی سوچ آ بھی گئی تھی تو پی کیوں نہ لیا۔ ماں کے سامنے کہنے کی جرأت کیوں کر لی۔

میں آپ کی سگی بیٹی ہوں اباجی.....؟ آہ.....! گویا میں ملزمہ سے مجرمہ بن گئی ہوں۔ وقار علی، مرد دور اندیش کیوں نہیں ہوتا، وہ کیوں وقت اور زمانے کو ٹھوکروں پر رکھتا ہے؟ تم نے کیوں مجھے آواز دے کر روکا۔ یہ داغ کون دھوے گا.....؟ تم کتنے آرام سے چلے گئے۔ آہ.....! بھابی نے تایا ابو تائی اماں سے کیا کیا کہا ہوگا۔ میں کیا کروں، کاش اباجی خدا آپ کو کوئی فیشن پرست، زمانہ ساز، خودسر بیٹی دیتا جو آج کے بجائے برسوں پہلے آپ کا سر جھکا دیتی، تب آپ کو میری قدر کا احساس ہوتا۔ اب کون ہے میرا، کیا اس داغ کے ساتھ زندگی گزاروں۔؟

نہیں، نہیں.....؟ یہ کوئی جینا ہوگا، کیا بھاگ جاؤں جنگلوں میں۔

یا ہپیوں کی ٹولی میں جگہ بنالوں یا دُنیا تیاگ دوں، غاروں میں چلی جاؤں یا خودکشی کر لوں.....؟ مگر کیوں، کیا کیا ہے میں نے.....؟

اس نے ایک دم چونک کر سر اُٹھایا۔ وہ کبھی صاحب الرائے نہیں تھی مگر اب صاحب فیصلہ تھی۔

♦ ♦ ♦

اس نے اپنے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں رکھے پرانی وضع کے ٹیلی فون سیٹ کو دیکھا، ایسا ٹیلی فون سیٹ جو پولیس اسٹیشنوں یا قدیم سرکاری دفتروں میں نظر آتا ہے۔ آج سے پہلے اس نے کبھی اپنے گھر میں ٹیلی فون کی موجودگی و اہمیت کا احساس نہیں کیا تھا۔ اسے کبھی کسی کا فون نہیں آیا تھا۔ جب سار یہ تھی تب اس کی سہیلیوں کے فون آجاتے تھے، وہ بھی اباجی کے آفس ٹائم میں۔ ریسیور اُٹھانے کی نوبت بھی اس وقت ہی آتی تھی جب رانگ نمبر پر کوئی ہوتا۔

اس نے اباجی کی پاکٹ ڈائری سے ایک نمبر نوٹ کیا اور خاموشی سے باہر چلی آئی۔ وقار علی کو گئے تین روز ہو چکے تھے۔

اباجی ریٹائرمنٹ کے بعد ایک پرائیویٹ فرم میں ڈپٹی ڈائریکٹر تھے، صبح کے گئے شام کو آتے تھے۔ جب ملازمت سرکاری تھی خوب عیش کرتے تھے، جب جی چاہتا چلے جاتے، ورنہ گھر میں پڑے گرجتے برستے رہتے۔ اب تو وقت نے انہیں ویسے ہی نچوڑ کر رکھ دیا تھا، آواز بھی دھیمی پڑ گئی تھی کروفر وہی تھا مگر تین روز سے تو وہ کروفر بھی رُخصت پر تھا۔ اب ایک معزول

شاہ کی سی حالت تھی ان کی۔

اس نے ڈرائنگ روم کا دروازہ بند کر کے خاموشی سے ریسیور اُٹھایا۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ دوسری جانب سے وقار علی کی آواز اُبھری تو اس کے ہاتھ پاؤں مزید لرز گئے۔

"ہیلو.....! وقار اسپیکنگ.....!"

"ہے.....ہے.....ہیلو.....!"

"جی محترمہ کس سے بات کرنا ہے.....؟"

"آ.....آپ.....آپ سے.....میں.....رانی.....!"

"اوہ.....کیسی ہو رانی.....؟"

"جو کچھ آپ کر گئے ہیں، اس لحاظ سے مجھے کیسا ہونا چاہئے.....؟"

"رانی.....میں خود شرمندگی کی آگ میں جھلس رہا ہوں۔ یہاں آکر بھی عائشہ نے۔"

"وقار صاحب.....! جو داغ آپ میرے دامن پر لگا گئے ہیں، اس سلسلے میں آپ کا کیا فرض بنتا ہے.....؟"

"یہی کہ میں سب کو یقین دلاؤں کہ تم بے قصور ہو۔"

"آپ کے خیال میں لوگ یقین کر لیں گے.....؟"

"پھر میں کیا کر سکتا ہوں.....؟"

"وقار صاحب.....!" اس کی آواز طیش سے کانپ گئی۔ "آباد تو پہلے بھی نہیں تھی مگر سر پر چادر تو تھی ناں.....؟"

"وقار صاحب.....! میں عام انسان ہوں، معاذ اللہ "اصحاب کہف" میں سے نہیں ہوں جو کسی کونے میں پڑی اونگھتی رہوں اور ایک مخصوص عرصے کے بعد آنکھ کھول کر دیکھوں کہ دُنیا پر ظلم و ناانصافی کتنی بڑھی یا گھٹی ہے، پھر آنکھیں موند کر پڑی رہوں، میرے بھی دل میں آرزوئیں جل سکتی ہیں، میں بھی عزت آبرو کے ساتھ اپنی عمر کی لڑکیوں کی طرح زندگی گزارنے کا سوچ سکتی ہوں۔ مجھے عام انسان بنایا گیا اور عام انسانوں کی طرح جینے کا حق دیا گیا۔ میں فرشتہ نہیں ہوں۔ میں بھی اور دوسروں جیسی انسان ہوں۔ دل و جذبات رکھنے والی معمولی انسان، ایک لڑکی۔ سن رہے ہیں آپ۔ میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ عورت کی روایتی مخصوص

زندگی سے محروم تھی تو کیا.....؟ عزت وآبرو تو تھی ناں میرے پاس۔ بتایئے یہ داغ لگانے کے بعد آپ کا کیا فرض بنتا ہے.....؟"

"میں نے بتایا ناں....."

"دوٹوک جواب دیجئے۔" وہ بات کاٹ کر بولی۔

"کیسا جواب چاہتی ہو.....؟"

"جواب، پوچھ کر نہیں دیئے جاتے۔ میرے داغ میں حصہ بٹا لیجئے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"آپ مجھے پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے بھی قبول ہیں۔" اس کی آواز دھیمی ہوگئی۔

"رانی.....؟"

خاموشی.....

"یہ بات میرے ذہن میں بھی آئی تھی، تمہارے ہی گھر میں۔ مگر یہ سوچ کر میری ہمت نہ پڑی کہ تم میرے گریبان تک نہ آجاؤ بپھر کر۔ جب سے آیا ہوں ضمیر کی سولی پر لٹک رہا ہوں، یہاں تمہیں برا بھلا کہا جارہا ہے اور میں کیسے بتاؤں۔"

"کیا کہتے ہیں اب.....؟"

"میں تمہارا مجرم ہوں رانی.....! اور بے ضمیر بھی نہیں۔ تم بہت اُونچی ہو۔"

"مگر اب پاؤں تلے آگئی ہوں۔"

"لیکن چچا اور چچی منظور کرلیں گے.....؟"

"ابا جی نے تو نامنظور کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ مگر اب وہی ہوگا جو میں کرنا چاہتی ہوں۔ میں زندہ لاش بن کر کڑھ کر زندگی نہیں گزار سکتی۔ سب مجھ پر تھوکیں گے اور شاید تھوک رہے ہیں۔ اب میں الزام سچے ثابت کرنا چاہتی ہوں۔ میں ایک ہی بار میں مرجانا چاہتی ہوں۔"

سسکیاں.....ہچکیاں۔

"میں یہ کہتے ہوئے خود کو بہت گھٹیا محسوس کررہا ہوں کہ تمہارے فیصلے نے مجھے خوشی دی ہے۔" کھٹاک.....! اس کے ساتھ ہی وقار علی نے فون رکھ دیا۔

♦ ♦ ♦

وقار علی کے سنگ زندگی گزارتے ہوئے بھی دُہرے لمحوں میں رہتی تھی۔ عائشہ گھر چھوڑ کر میکے جاچکی تھی۔ گڈو وقار علی کے پاس ہی تھا اور رانی سے ماں سے بڑھ کر محبت پارہا تھا۔

وہ وقار علی کا گھر سنبھال بیٹھی تھی، پچھلے واقعات فلم کی طرح اس کے ذہن میں بھی گردش کرتے رہتے۔ امی کی منتیں، سسکیاں، ابا جی کی گرجتی آواز "میں اسے جان سے ماردوں گا۔" عائشہ کا نشتر چلا کر گھر پر لعنت بھیج کر میکے چلے جانا۔

وقار علی نے کنوارے دُلہا سے بڑھ کر اسے محبتیں دی تھیں۔ ان کی طلب، ان کی پسند، ان کے پہلو میں تھی۔ وہ خود غرضی کی حد تک مطمئن تھے۔

اسے اس قدر ٹوٹ کر چاہا تھا کہ وہ ان کی دیوانی ہوگئی تھی۔ اس قدر شدت سے وقار علی نے اسے چاہا تھا کہ اس کی پور پور، اس کا روم روم ان کی محبت کی شدت کا گواہ تھا۔

مگر ایک بے کلی سی اب بھی تھی۔ ایک کانٹا اب بھی اسے رگید رہا تھا۔ وہ احتساب کے لمحوں میں نہایت افسردہ ہوجایا کرتی۔ تب وقار علی پوچھ بیٹھتے۔

"زندگی.....! اب کیا غلطی کر بیٹھا ہوں.....؟"

"آپ عائشہ کو لے آئیں۔"

"پھر اس کا انجام جانتی ہو.....؟"

"میں آپ کی منت کرتی ہوں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "وہ اپنے بیٹے کے لئے تڑپتی ہوں گی۔ میں خود کو باندی بنا کر رکھوں گی ان کی۔ آپ میرے شریک حیات نہیں، میرے دامن پر لگے داغ کے ساجھی ہیں۔ شریک حیات تو عائشہ کے ہیں۔"

"ابھی تمہیں احساس نہیں رانی، مگر۔"

"دیکھیں وقار.....! بے گناہ میں بھی تھی اور قصوروار عائشہ بھی نہیں، سمجھ رہے ہیں ناں۔"

وقار علی تو عائشہ کو بہت بار بلا چکے تھے مگر وہ اکڑ میں بیٹھی تھیں۔

اس بار جو کہا تو بنا حجت چلی آئیں۔ ان کا سفید رنگ زردی مائل ہورہا تھا۔ بے حد شکست خوردہ سی تھیں۔ میکے میں بیوہ ماں کسی گنتی میں نہ تھیں، بھابیوں نے کس بل نکال دیئے تھے، وہ کھڑکی سے کھڑی جھانکتی رہی۔ باہر آنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ گڈو نرسری سے لوٹا تھا۔ وہ کرسی پر خاموش بیٹھی وقار علی کے پل اور پر سلائیاں چلاتی رہی۔

گیٹ پر شور سا ہوا۔ غالباً گڈو آ گیا تھا۔ اس نے اُون سلائیاں ایک طرف رکھ دیں اور باہر چلی آئی۔ گھر پر سناٹا تھا، اس نے گڈو کے ہاتھ سے بستہ لیا، اس کی بس واپس پلٹ رہی تھی، وہ گڈو کا ہاتھ تھامے عائشہ کے بیڈروم میں چلی آئی جو اس نے ان کی آمد سے قبل ہی کھولا تھا۔

وہ پاؤں لٹکائے کچھ سوچ رہی تھیں۔ اس نے کھنکھار کر حلق صاف کیا۔

''السلام علیکم.....!''

''وعلیکم السلام.....!'' عائشہ کی آواز ہر جذبے سے عاری تھی، البتہ وہ کچھ حیران تھیں۔ ان کے اندازے کے مطابق اس کی چال میں ایک فاتحانہ پن ہونا چاہئے تھا۔

''گڈو.....! جاؤ بیٹا امی کو سلام کرو۔'' اس نے گڈو کو آگے کیا جو دس ماہ قبل بچھڑی ماں کو حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔

''یہ بیٹا ہے میرا.....'' سلام کرے یا جوتے مارے، تم پٹیاں پڑھانے والی کون.....؟ دفعان ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔'' عائشہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگیں۔ وہ ایک دم ڈر گئی، مگر پھر فوراً ہی سنبھل گئی۔ عائشہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔

تب وہ ان کے پیروں کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''یہ ظلم تو آپ نے مجھ پر خود ہی کیا ہے۔ آپ میری صفائی پر یقین کر لیتیں، آپ نے کیوں داغ کو گہن بنانے کا اعلان کیا۔ کیوں تشہیر کرنے کی قسم اُٹھائی۔ آپ چپ رہنے کا عہد کر لیتیں، مجھے بے قصور مان لیتیں تو میں عمر گزار دیتی۔ میں نے وقار علی سے عشق نہیں کیا، انہیں شریک حیات نہیں بنایا، وہ میری رسوائیوں کے حصے دار ہیں، میری چادر پر لگے داغ کے ساجھی ہیں۔ میرے معشوق، میرے محبوب، میری زندگی کے شریک نہیں۔ وہ تو سب کچھ آپ کے ہیں۔ میرے تو بس رسوائیوں کے ساجھی ہیں۔ قصور ان کا تھا، سزا میں اکیلے کیوں کاٹتی.....؟''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

عائشہ نے اُسے بازوؤں سے پکڑ کر گلے سے لگا لیا۔ اب دونوں طرف طغیانی تھی۔

⌘ ⌘ ⌘